ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قیام پاکستان سے قبل خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خوکلامی کے تجربات

The use of various literary techniques is seen in Urdu fiction from the very beginning. One of the psychological techniques used by female fiction writers before partition is a monologue. Asmat Chughtai and Mumtaz Shireen are prominent female fiction writers of that era. In both of these, the rebellious way of social rhetoric is expressed through the monologue. In particular, the social pressure and its emotional tragedies are described by monologue and soliloquy. This article deals with all those reasons and motives that causes monologue in the fiction of pre- Pakistan women fiction writers.

اردو افسانے کی ابتدا ہی مختلف النوع فنی و تکنیکی تجربات کے رد و قبول سے ہوتی ہے۔ ابتدائی افسانہ نگاروں کے ہاں بیانیہ تکنیک کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نفسیاتی تکنیکوں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ تاہم یہ نفسیاتی تکنیکیں ہر گز شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کے پس پردہ وہ لاشعوری محرکات موجود ہیں جو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل اردو افسانہ نگاری کی جو روایت ملتی ہے اس میں مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگار بھی قابل ذکر ہیں۔ اس وقت کے تناظر میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد اگرچہ آٹے میں نمک کے برابر تھی لیکن یہ تمام خواتین اپنے عہد اور حالات کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ چنانچہ ان خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں نفسیاتی دروں بینی اور ژرف نگاہی کا واضح اظہار ملتا ہے۔ اردو افسانے کی اسی روایت کا ایک اہم نام عصمت چغتائی ہے۔ عصمت چغتائی اردو افسانے کی روایت میں ایک باغیانہ آواز ہے۔ انھوں نے خانگی زندگی کی کٹھنائیوں اور جبر کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں عورت کی یہ دبی ہوئی آواز خود کلامی کے ذریعے اظہار پاتی ہے۔ عصمت چغتائی سماجی پابندیوں اور عورتوں کے حوالے سے منافقانہ روش کے خلاف ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں معاشرتی اصول و ضوابط کے خلاف بغاوت کا روّیہ نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔

> عصمت چغتائی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے متوسط طبقے کی ان عورتوں کی ترجمانی کی ہے جو اب تک گونگی اور بے نام تھیں۔ انھوں نے ان کے باطن کی ان کہی کہانیاں ایسے دلچسپ انداز اور انھیں کی زبان، روزمرّہ و محاورہ میں ایسی بے باکی سے سنائی ہیں کہ اس سلسلے میں پہلے ایسی کہانیاں اس طور پر نہیں لکھی گئی تھیں۔[1]

اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں عورت گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ اسے جذبات کے اظہار اور حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی بھی آزادی نہیں تھی۔ رشتوں کے دائرے نے اسے مکمل طور پر محبوس زدہ زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ چنانچہ عورت اور مرد کے حقوق و فرائض میں عدم توازن نے جسمعاشرتی ناانصافی کو جنم دیا عصمت چغتائی کے افسانوں کے کردار اس کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ عصمت چغتائی عورت کے حوالے سے دوہرے معاشرتی معیارات سے شدید الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ الجھن ان کے کرداروں کی خود کلامی سے اظہار پاتی ہے۔

> راحت! کبھی یہ بھی سوچتی ہوں کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گے۔ کب تک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنائے چار دیواری میں قید رکھیں گے۔ کب تک یوں ہم دبے مار کھاتے رہیں گے۔[۲]

عصمت چغتائی کے افسانوں کی پہچان ان کا یہی جرأت مندانہ اور بے باکانہ لب و لہجہ ہے۔ ان کے افسانوں میں مروجہ روایات اور مسلمہ اقدار سے انحراف کا جو رجان ملتا ہے اس کا محرک ان کی خانگی زندگی کی بدمزگیاں اور گھٹن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عورت کی نفسیاتی ضروریات اور جذبات و احساسات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ عورت کی نفسیاتی الجھنوں اور غلط معاشرتی اصول و ضوابط کے خلاف شدید بغاوت کا احساس ان کی کہانیوں میں داخلی خود کلامی کی ذریعے اظہار پاتا ہے۔ افسانہ ''نفرت'' میں انھوں نے بچپن کی نفرت اور ناپسندیدگی کو سماجی ناہمواریوں کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بچپن کی کج روی نے مُنّو اور فخر النساء کے ذہنوں میں تنافر کے جس احساس کو ختم کر دیا ہے، وہ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ شدید ہوتا گیا۔

> اس کا جی چاہتا کوئی اس گوشت کے لوتھڑے کو چیل چلو کر دے۔ کوّں کو کھلا دے۔ اس نے ایک نہیں ہزار دلہنیں دیکھی تھیں۔ پر اتنی ذلیل دلہن کاہے کو دیکھی ہوگی۔ رال تھی کہ اس کے منہ سے نالی کی طرح بہے جاتی اور سارے دالان میں پوتڑے تکونیاں پھیلی مہکا کرتیں۔[۳]

یہاں انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں بے جوڑ شادیوں جیسے نام نہاد سماجی اور اخلاقی ضابطوں اور روّیوں کے انہدام کی کوشش کی ہے۔ ایک کمسن بچے کے ذہن میں دلہن کا حسین تصوّر موجود ہے، اسے نوزائیدہ بچی کے ساتھ منسوب کیے جانے سے جو شدید ٹھیس مُنو کو پہنچتی ہے اسے عصمت چغتائی نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ فخر النساء کی پیدائش نے مُنو کے بچپن میں جس بدمزگی اور بے قاعدگی کو جنم دیا ہے اسے وہ ساری زندگی معاف نہیں کر سکا۔ کمسنی کی یہ تکلیف اس کے لاشعور میں ایک حادثے کی صورت جاگزیں ہے اس لیے وہ فخر النساء کو تکلیف دے کر سکون محسوس کرتا ہے۔

> مُنو کا جی چاہتا اسے نمونیا ہو یا چیچک نکلے اور وہ مرے یا کم از کم اپاہج ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا۔ اس کا موٹا سا دودھ بھرا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ بڑا سا پتھر اٹھا چپکے چپکے جائے اور دھم سے اس پر پٹخ

مارے مگر عین وقت پر یا تو کوئی ادھر آ جاتا یا وہ خود ہی جاگ کر چلانے لگتی، یا پتھر بھاری ہوتا۔[۴]

عصمت چغتائی کے نسوانی کردار اردو افسانوی دنیا میں نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل لے کر سامنے آتے ہیں۔ وہ عہدِ بلوغت کی بے جا پابندیوں اور اس سے جنم لینے والے مشتعل اور باغی کرداروں کے خلاف ہیں۔ یہ دور نوجوان اذہان کے لیے انتہائی حساس دور ہوتا ہے اس لیے اس دور میں لڑکوں اور لڑکیوں کو بے جا معاشرتی قدغنوں سے بچانا چاہیے کیونکہ اس دور کی جذباتی گھٹن انھیں مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث کر دیتی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کی کردار نوجوان لڑکیاں ہیں۔ یہ لڑکیاں گھریلو جبر اور گھٹن کے آگے بے بس ہیں۔ ان کے لیے واحد آزادی کا گوشہ گھر کا غسلخانہ ہے جہاں وہ اپنی پوری ذہنی و جسمانی آزادی کے ساتھ سوچ اور سمجھ سکتی ہیں۔

> غسل خانے کی فضا میں سوراج مل جاتا، آزادی، پر پرزوں سے آزاد۔۔۔مزے سے چوکی پر سے نل کی پٹڑی پر وہاں سے میلے کپڑوں کے پاس پھر صابن لینے یا بیسن اتارنے الماری کے بالائی حصّہ پر آزادی سے پھدکا کرتیں۔ بے کار بے کار ہی وہ کلانچیں بھرتیں۔ ہوا جسم پر لپٹ جاتی۔ ہاتھ پیر ہلکے ہو جاتے صابن ملتیں چکنے چکنے ہاتھ ایسے پھسلتے کیا بتائے جیسے کسی نے ریشمی کپڑوں میں لپیٹ دیا ہو۔ بیسن ملتیں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی سوزش۔[۵]

مصنفہ اپنے معاشرے کی اس عورت سے سخت بدظن ہیں جو جسمانی مجبوریوں کو خود پر اس حد تک حاوی کر لیتی ہیں کہ ان کی اپنی ذات کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ انھیں خاموش عورت کی خاموشی سے سخت نفرت ہے۔ ان کی آئیڈیل ایسی عورت ہے جو صدیوں پرانی زنجیروں کو توڑ کر اپنے حقوق کی بحالی کے لیے آواز اٹھائے۔ یہ آواز انکے کرداروں کے داخل کی آواز بن کر ان کے افسانوں میں اظہار پاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار وہ اپنے ایک مضمون میں کرتی ہیں۔

> آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ میں خدا کے آگے گڑ گڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ مجھے لڑکا بنا دے۔ مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی بھالی لڑکیاں بڑی چلتا پُرزہ ہیں جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔[۶]

عصمت چغتائی نے عورت کو انسانی جبلت اور نفسیات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کی داخلی کشمکش اور ذہنی الجھنوں کو اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں۔ افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' میں انھوں نے ایسی نوجوان لڑکیوں کے داخلی کرب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو اپنی ساری جوانی سہاگ کے جوڑے کی آرزو میں گزار دیتی ہیں۔ آنے والے رشتوں کی آہٹ ان کی زندگیوں میں چھوٹے چھوٹے بھونچال لاتی رہتی ہے۔

اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ [۷]

بالآخر زندگی کے کسی موڑ پر جب امید کے دیئے ٹمٹمانے لگتے ہیں تو وہ خود زندگی کے آگے ہار جاتی ہیں۔ یہ افسانہ بیک وقت کئی نسوانی کرداروں کا المیہ ہے۔ ماں کا بھی جو بیٹی کے لیے چوتھی کا جوڑا سیتی سیتی اس کا کفن سینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کبریٰ جو سہاگ کے جوڑے کی آرزو میں دنیا سے سدھار گئی اور حمیدہ جو اپنی بہن کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی آبرو کی بھی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتی۔ یہ کردار ہمارے گرد و پیش کے حقیقی کردار ہیں۔ اور اس زمانے کے تباہ حال مسلمان گھرانوں کا نوحہ بن کر سامنے آتے ہیں جہاں گھر کی دہلیز پر بیٹھی جوان بیٹیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ حمیدہ کی ماں ساری زندگی بیٹی کے لیے چوتھی کا جوڑا سیتی رہی اور بالآخر انھی ہاتھوں سے جوان بیٹی کا کفن بھی سی رہی ہے۔ عصمت چغتائی نے اس بے زبان کردار کی داخلی آواز کو خود کلامی کے ذریعے بیان کیا ہے۔

> تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی، گالوں کی سنسان جھرّیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں۔۔۔ لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتہ کیا، اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا جوڑا سیا نہ جائے۔۔۔ بی اماں نے آخری ٹانکا بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے سے رینگنے لگے۔۔۔ وہ مسکرا دیں، جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا ہو کہ ان کی کبریٰ کا سُوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو۔ [۸]

یہ افسانہ ہمارے معاشرے میں عورت کے اس روپ کو اجاگر کرتا ہے جو کنیز یا باندی کا ہے۔ عصمت چغتائی اس عورت کے بارے میں انسان دشمن سماج کے روّیے پر شدید احتجاج کرتی ہیں۔ سماجی نظام کی بھینٹ چڑھنے والی یہ عورتیں عصمت چغتائی کے افسانوں میں سراپا احتجاج نظر آتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے عورت پر سماجی دباؤ اور اس کی جذباتی وجسمانی تذلیل کے المیوں کو خود کلامی کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کے نسوانی کردار انفرادی ردِّعمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے کرداروں کی مجبوریوں کو معاشرتی معیارات اور اخلاقی وقانونی تقاضوں کے تناظر میں بیان کرتی ہیں۔ افسانہ ''یار'' میں انھوں نے غیر شرعی رشتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے محرکات سے پردہ اٹھایا ہے۔ فریدہ اکبر کی بیوی ہے اور ریاض اس کے شوہر کا دوست ہے۔ اکبر کی دفتری مصروفیات، لاپرواہی اور بے اعتنائی فریدہ کو ریاض کے قریب کر دیتی ہے۔ وہ توجہ جو اکبر سے ملنی چاہیے تھی اسے ریاض دے رہا تھا اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض کے سہارے کی محتاج بن گئی ہے۔ دونوں کے اس غیر شرعی

رشتے نے فریدہ کوجس معاشرتی تنقید سے دوچار کردیا ہے اس کا ردِّعمل اس کردار کی خودکلامی کے ذریعے ہوتا ہے۔عصمت چغتائی ایک معروضی مبصر کی حیثیت سے افسانے میں اس کردار کے داخلی مدو جزر سے آگاہ کرتی ہیں۔

فریدہ کو ذرا کوفت ہوئی کتنے چیپ ہیں یہ لوگ۔۔۔اُنھ لعنت! انھیں کون سمجھائے۔کئی بار لوگوں نے غلطی سے ریاض کو اس کا شوہر سمجھ لیا اسے بُرا نہ لگا۔ضرور وہ لوگ احمق سے لگے۔اُنھ کیا ہوتا ہے۔ان باتوں سے کیا بگڑتا ہے۔[9]

معاشرتی معیارات کے خلاف تذلیل اور ہتک کا یہ احساس اس کردار کے داخلی کرب کو ظاہر کر رہا ہے۔اپنی زندگی کے بیس برس ریاض کی مالی وجذباتی وابستگی کے سہارے گزارنے کے بعد اس کے لیے یہ سوچنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ ریاض کی نہیں اکبر کی ذمہ داری ہے۔چنانچہ افسانے کے اختتام پر فریدہ کا بھائی جب اسے ''یار'' کا طعنہ دیتا ہے تو وہ اس پر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتی کیونکہ وہ خود بھی کہیں نہ کہیں اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے۔

یار! فریدہ کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے۔۔۔ریاض اس کا یار ہے۔مگر ہنسی اس کے گلے میں سسک کر رہ گئی۔ بیس برس زن زن کرتے نظروں میں گھوم گئے۔یار! دنیا کی نظروں میں ریاض اس کا یار نہ تھا، تو پھر کون تھا۔۔۔؟[10]

عصمت چغتائی نے اپنے کرداروں کی ان نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو خواب اور حقیقت کے تصادم سے جنم لیتی ہیں۔افسانہ ''اس کے خواب'' میں انھوں نے حقائق سے نظریں چرانے والے ایک نوجوان کی ذہنی واردات کو خودکلامی کے ذریعے پیش کیا ہے۔یہ نوجوان خارجی متعلقات سے منہ موڑ کر خوابوں کی دنیا میں رہنے کا اسیر ہے۔خوابوں میں رہتے ہوئے جز وقتی مسرت اور سکون سے تو دوچار ہوتا ہے لیکن جونہی وہ حقیقی دنیا میں واپس آیا ایک بار پھر اسی تکلیف اور اذیت سے دوچار ہونے لگتا ہے۔حقائق سے دوری کے سبب اسے باہر کی دنیا غیر مناسب اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی ہے۔عصمت چغتائی نے اس کردار کے داخلی تجزیے اور خودکلامی کے ذریعے اس کے محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اس کردار کے ذہنی ہیجان کی اصل وجہ اس شخصیت کا احساسِ کمتری ہے۔یہی احساس اسے ہر لمحہ بیرونی دنیا سے منہ موڑنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

افسوس اس کی اپنی گردن کُھردری اور دھوپ سے جلی ہوئی تھی اور قبل از وقت بال جھڑنے پر آمادہ تھے، مگر کوئی پرواہ نہیں، خواب میں ان باتوں کا جھگڑا نہیں ہوتا۔بس تو ہزاروں لڑکیاں جو لازمی طور پر حسین اور جوان ہوتیں اس پر مرجاتیں۔پلندے کے پلندے ڈاک سے خطوں کے آتے۔کمرہ پھولوں کے تحفوں سے بھر جاتا۔اور وہ ان کے عشق سے تنگ آجاتا۔مگر ان میں سے سب سے زیادہ حسین اور جوان اس کا کہیں بھی پیچھا نہ چھوڑتی۔وہ تو اس پر جان فدا کرتی۔اور وہ کھنچتا، وہ لپٹتی یہ بھاگتا، وہ ندیدی بلی کی طرح اس کے

چاروں طرف گھومتی پر وہ گیانی سادھو کی طرح اسے دھتکارتا۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتی۔ یہ اُسے بھول جاتا۔ [۱۱]

اسی دور میں اردو افسانے میں خود کلامی کے حوالے سے ایک اور غالب نام ممتاز شیریں کا ہے۔ ممتاز شیریں کا شمار افسانہ نگاروں کی اس صف میں ہوتا ہے جو کرداروں کے خارجی کوائف سے زیادہ داخلی احوال میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ممتاز شیریں کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس صف میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے نسائی نفسیات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے جسے ادبی بصیرت کہا جا سکتا ہے۔ ممتاز شیریں کو مشرقی عورت کی داخلی و خارجی زندگی کا جو تجربہ اور مشاہدہ میسر تھا اسے انھوں نے اپنی تخلیقیت اور نفسیاتی دروں بینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہر عمر سے تعلق رکھنے والے ایسے کردار مل جاتے ہیں جن کی بصارت پر بھروسہ کر کے ہم عورت کے ظاہر و باطن کی ان گنت صداقتوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ افسانہ ''آئینہ'' میں انھوں نے آئینے کے سامنے کھڑی ایک نوجوان لڑکی کی ذہنی کیفیات کو خود کلامی کے انداز میں اس طرح سے بیان کیا ہے۔

> ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینے نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال تمتما رہے تھے۔۔۔ ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لیے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز۔۔۔ ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟۔۔۔ پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ [۱۲]

واحد متکلم کی یہ خود کلامی محض اس کا جذباتی بیان نہیں بلکہ اس میں ایک نوخیز لڑکی کی پوری ذہنی واردات پوشیدہ ہے۔ اس عمر کی لڑکیوں میں ایک خاص قسم کی شوخی اور چنچل پن ہوتا ہے۔ وہ خود کو ہر طرح سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ افسانے کی واحد متکلم بھی اپنی قابلیت پر نازاں ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا احساسِ تفاخر موجود ہے جس کا اظہار اس کے داخلی بیان سے ہوتا ہے۔

> بی اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینے کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا۔۔۔ گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرے پر بدلتے جذبات کو یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کینوس پر کھینچا ہو۔ [۱۳]

واحد متکلم کی یہ ساری گفتگو آئینے میں کھڑی اپنی تصویر کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے جذبات کی خود ہی ہم راز ہے اس لیے تنہائی میں آئینے کے ساتھ ہم کلام ہے۔ افسانہ نگار نے نوجوان لڑکیوں کے سراپے میں خود ستائی کے جس جذبے کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے وہ اس عمر کی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ اس عمر کی لڑکیوں میں اپنی اہمیت کا احساس شدت سے سر اٹھاتا ہے

اس لیے وہ اپنے حسن وسراپے کے حوالے سے بے حد حساس ہو جاتی ہیں اور توجہ چاہتی ہیں۔اس افسانے کی واحد متکلم کے لیے یہ سوچ ہی مسحور کن ہے کہ اس کی سہیلیاں اس کی کامیابی پر کس طرح اس کی ناز برداری کریں گی۔

> سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی اور میں بناوٹی غصّہ سے یوں منہ بنالوں گی۔۔۔ارے تو غصّہ بھی مجھے بھاتا ہے۔منہ پھلائے ہوئے بھی میں اچھی لگتی ہوں۔یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔۔۔واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو، دیکھ لو، جس طرح بھی چاہے دیکھ لو۔۔۔ہاں تو میں اپنے چہرے پر یوں مصنوعی غصّہ پیدا کرلوں گی۔[۱۴]

ابتدائی طور پر یہ افسانہ واحد متکلم کی جذباتی کیفیات کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔آگے چل کر واحد متکلم کی نانی کی وفات کہانی کو نیا رُخ عطا کرتی ہے۔وفات کی یہ خبر سنتے ہی اُسے بچپن میں نانی کے ساتھ گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے۔یوں پوری کہانی یادوں کی صورت میں چلتی ہے۔اس افسانے سے متعلق خود ممتاز شیریں کہتی ہیں۔

> ''آئینہ ایک تہہ دار افسانہ ہے جس کی مختلف سطحیں ہیں۔پہلی سطح میں یہ صرف بوڑھی نانی کی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ نانی کی پوری زندگی کے المیہ کی داستان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔جوانی اور بڑھاپے کے ٹکراؤ، انسانی زندگی کی پہلی تازگی اور انسانی زندگی کی بوسیدگی کا تضاد اور زندگی طربیے اور المیے کے تصادم سے آئینہ کی خاص فضا بنی ہے۔خوشیوں، تمناؤں، اُمیدوں سے معمور زندگی کے طربیہ نشہ سے مخمور لڑکی اچانک زندگی کے المیہ سے دوچار ہوتی ہے اور یہ تصادم اور تضاد کا اہم موڑ ہے۔[۱۵]

یہ محض تبصرہ نہیں حقیقت بھی ہے۔یہاں لفظ آئینہ میں بھی تہہ داری ہے۔ایک آئینہ وہ ہے جس کے سامنے کھڑی لڑکی بن سنور رہی ہے جبکہ دوسرا آئینہ نانی جی کی ذات ہے جس میں یہ لڑکی اپنی دنیا اور اپنی شخصیت کا عکس دیکھتی ہے اور پھر نہ صرف اس کی شخصیت کا گہرا اثر قبول کرتی ہے بلکہ اپنی ذات کی نرگسیت سے بھی باہر نکل آتی ہے۔

ممتاز شیریں کے افسانہ ''انگڑائی'' میں بھی وہی جذباتیت اور خود ستائی نظر آتی ہے جو عنفوانِ شباب سے عبارت ہے تاہم اسے ہم شخصی ناآسودگی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ایک صحت مند جذبے کے طور پر سامنے آتی ہے۔اس افسانے میں ممتاز شیریں نے ہم جنسیت کے موضوع کو چھیڑا ہے اور اس کے ہیجانی تجربات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے محرکات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ہم جنس پرستی عمر کے ایک خاص دور کا تقاضا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک نارمل انسان اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔افسانہ ''انگڑائی'' کی گلنار بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو کالج کے زمانے میں اپنی ایک ٹیچر سے جذباتی رشتے میں ملوث رہی ہے۔گلناز اور مس فنانس کے درمیان موجود یہ رشتہ عمر کے ایک خاص دور کی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔

میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسّم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ انھیں مس فنانس کی بجائے ''اینجلنا'' کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں ''میری اینجلنا'' مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا؟ خطوں میں جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ [۱۶]

یہ جذباتی ہیجان عمر کے ایک خاص دور سے مشروط تھا چنانچہ جنسِ مخالف سے جذباتی سہارا ملنے کے بعد گلنار کے اندر اس روّیے کے خلاف ایک ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اب یہ کردار فطری نشو و نما کے ساتھ آگے بڑھنے لگتا ہے۔ افسانے میں ہم جنسیت پرستی کا روّیہ دونوں کرداروں میں بیک وقت نظر آتا ہے۔ مگر جب گلنار کی منگنی پرویز سے ہو جاتی ہے تو پرویز کی محبت مس فنانس کے خیال پر غالب آجاتی ہے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز!۔۔۔ اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی۔ جذبات کی ایک رنگین دنیا۔ ہاں نہایت حسین کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین۔ [۱۷]

یہ ہم جنسیت پرستی کے خلاف فطری ردِّ عمل ہے جسے ممتاز شیریں نے گلنار کی ذہنی واردات کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ گلنار اب اپنے اس گذشتہ تجربے پر پشیمان ہے اس لیے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس ردِّ عمل کا اظہار اس کی خود کلامی کے ذریعے ہوتا ہے۔

ہونہہ! میں انھیں کیسے حیران کر دوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی نا۔ ''کیسی خوبصورت ساری ہے۔'' اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انھیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔۔۔ جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی۔؟ [۱۸]

ممتاز شیریں کے افسانوں کے کردار جذباتی طور پر نا آسودہ ہیں۔ ''گھنیری بدلیوں میں'' ایک نو بیاہتا عورت کی جذباتی تشنگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ عورت اپنے شوہر سے توجہ اور محبت چاہتی ہے۔ چنانچہ اسے اپنے شوہر کی چھوٹی چھوٹی مصروفیات بھی اپنی رقیب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ احساسِ تنہائی اور احساسِ بیگانگی اسے داخلی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ممتاز شیریں نے اس کردار کی داخلی کیفیات کو خود کلامی کے ذریعے بیان کیا ہے۔

وہ کوئی ان پڑھ لڑکی تو نہ تھی کہ کتابوں سے بیر رکھتی۔ اسے بھی کتابیں پسند تھیں، لیکن کوئی یوں بھی پڑھتا ہوگا۔ ان بے جان کاغذ کے تودوں کے سامنے اس کا دکھتا ہوا دل کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جمیل کو اتنا بھی احساس

نہیں کہ وہ دن بھر اس کے انتظار میں کتنی اداس رہی ہے۔ اُف یہ انتظار! مسلسل انتظار! وہ اس وقت بھی اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ [19]

قیام پاکستان سے قبل خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں میں خودکلامی کے رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان ابتدائی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں داخلی کلام اور ذہنی کیفیات کا بیان کرداروں کے لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہے۔ اگر چہ اس عہد میں دیگر اصناف ادب کی طرح اردو افسانہ بھی مغربی تحریکوں اور رجحانات کا اثر قبول کر رہا تھا تاہم باضابطہ طور پر یہ تکنیکیں ابھی متعارف نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس عہد میں خواتین افساہ نگاروں کے ہاں سماجی و معاشرتی قدغنوں کے خلاف بغاوت کا اظہار خودکلامی کے پیرائے میں ہوتا نظر آتا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں کرداروں کے لاشعوری محرکات، احساس کمتری، ناآسودہ خواہشات، جذباتی انخلا اور معاشرتی جبر و گھٹن کا اظہار ان کرداروں کے داخلی کلام سے منکشف ہوتا ہے۔ یوں یہ تکنیکیں فرد کے ذہنی و داخلی رویوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے ارتقا میں بھی ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، عصمت چغتائی، مشمولہ: معاصر ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۰

۲۔ عصمت چغتائی، جنازے، مشمولہ: کلیات عصمت چغتائی (مرتب)، طارق محمود، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۶۸

۳۔ عصمت چغتائی، ایک بات، نیا ادارہ، لاہور، س ن، ص ۴۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۱۔۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۷۸۔۷۷

۶۔ عصمت چغتائی، دوزخ، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۳

۷۔ عصمت چغتائی، ایک بات، نیا ادارہ، لاہور، س ن، ص ۲۱۰۔۲۰۹

۸۔ ایضاً، ص ۲۲۳۔۲۲۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۱۱۔ عصمت چغتائی، چوٹیں، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۰ء، ص ۶۵۔۶۴

۱۲۔ ممتاز شیریں، اپنی نگریا، مکتبہ جدید، لاہور، بارِ دوم ۱۹۶۹ء، ص ۱۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۵۔ دیباچہ (نقش ثانی)، اپنی نگریا، ایضاً، ص ۱۶۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۷۔ ممتاز شیریں، اپنی نگریا، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۲۔۴۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۹